محمد حنیف ندوی

تاثرات

(۶)

ان تفصیلات کے بعد اس مسئلہ پر غور فرمایئے کہ کیا یہ عالم ہست و بود حقیقی ہے اور خارج میں پایا جاتا ہے، یا محض وہم و فکر کی اختراع، اور ذہن و اندیشہ کی کرشمہ سازی ہے؟ جیسا کہ تصوریت کے حامی کہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ تنقیح نئے علم الکلام میں اوّل درجے کی اہمیت چاہتی ہے۔ یہ ایسا بنیادی نکتہ ہے جس کی وضاحت سے ہماری تہذیب و ثقافت کا رُخ صحیح معنوں میں متعین ہوتا ہے۔ اور جس کی تشریح سے ٹھیک ٹھیک معلوم ہو سکتا ہے کہ ہماری دنیاوی زندگی کا مزاج، نقشہ اور انداز کیسا ہونا چاہیے۔

تاریخ مذاہب میں شروع ہی سے دو مختلف رجحان چلے آ رہے ہیں، ایک یہ کہ یہ عالم رنگ و بو حقیقی ہے، توجہ طلب ہے، اور اس لائق ہے کہ یہاں تہذیب و تمدن کے ایوان تعمیر ہوں، زندگی کے دبستان سجائے جائیں، اور اس کے مضمرات ارتقاء کو آگے بڑھایا جائے، اس کے اضداد کو دُور کیا جائے۔ اس کی تلخیوں کو کم کیا جائے، اور کوشش کی جائے کہ اس گہوارۂ ارض کو بنی نوع انسان کے حق میں زیادہ سے زیادہ سازگار، زیادہ سے زیادہ فرحت آفرین، اور زیادہ سے زیادہ اخلاق و آداب کا حامل بنایا جائے۔

اس کے مقابلہ میں دوسرا رجحان جس نے ماضی میں مذہب، تصوف اور فلسفہ کو بڑی حد تک متاثر کیا ہے، یہ ہے کہ یہ دنیا سراسر باطل ہے منبع شر اور سرچشمۂ فساد ہے، لہٰذا اسے سنوارنے، بنانے اور ترقی دینے کی قطعی ضرورت نہیں اور یہ ہرگز اس لائق نہیں کہ ذہن و فکر کی

پاکیزہ اور اونچی صلاحیتوں کو اس کی عارضی مسرتوں اور ادنیٰ لذتوں کے لیے بروئے کار لایا جائے یہی نہیں اس سے دامن کشاں رہنا اور اس کو درخور اعتنا نہ سمجھنا ہی حاصلِ حیات ہے۔

یہ دونوں رجحان اتنے ہی پرانے اور قدیم ہیں کہ جتنا خود مذہب، انسان، تہذیب اور تاریخ۔ دونوں کے نتائج و اثرات بالکل واضح اور ممیز ہیں۔

پہلے نقطۂ نظر نے شرائع، قانون اور زندگی کے بوقلموں سانچوں کو جنم دیا ہے، تہذیب و تمدن کے خوش رنگ ریاض ترتیب دیے ہیں۔ علوم و فنون کے ارتقا میں قابل قدر کردار ادا کیا ہے۔ نیز انسانی عظمت و ہمت کو اس درجہ ابھار دیا ہے کہ وہ ستاروں پر کمندیں پھینک سکے اور ماہ و پروین کے اسرارِ سربستہ کو آشکار کر سکے۔ مگر یہ تصویر کا ایک رُخ ہے۔ دوسرا رُخ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے انسان عقائد کی اطمینان آفرینیوں سے محروم ہو گیا ہے۔ اخلاق و اقدار سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے اور فکر و اندیشہ کی برّاقیوں کے باوجود باطن کی تیرگی کا بُری طرح شکار ہے۔ اس اسلوب و تصور سے زندگی اس درجہ مصروف اور پیچیدہ ہو گئی ہے، اور روزمرہ کی ضروریات و حوائج نے اس طرح انسانی فکر و التفات کو گھیر رکھا ہے کہ لطائف اخلاق اور لطائف اعمال کے لیے فرصت و گنجائش کے امکانات ہی نہیں رہے۔ ان حالات میں انسان غیر مادی نصب العین کے بارے میں غور کرے تو کب؟ اور روحانی اقدار کی طرف بڑھے تو کس طرح؟ دوسرے نقطۂ نظر سے تصوف کے ایک خاص مکتبِ فکر کی بنیادیں استوار ہوئی ہیں، کردار و عمل کے فرازوں نے بلندی اور پاکیزگی حاصل کی ہے۔ استغنا، توکل، بے نیازی، اخلاص اور انسان دوستی کی شمیم آرائیوں نے فضائے اخلاق کو مہکایا اور ہمسر گلشن ٹھیرایا ہے۔ اور یہی نقطۂ نظر ہے جس سے دنیا بھر کے ادب میں ایک طرح کا عمق اور نکھار پیدا ہوا ہے، آفاقیت معنویت اور وسعت نظر ابھری ہے، جس سے روح، باطن اور اقدار کا فرق قائم ہوا ہے۔ اور جس کی بدولت ادب میں اس انداز کی صلاحیتیں معرضِ ظہور میں آئی ہیں کہ وہ صرف ذہن کے بجائے قلب و جگر کی تسکین و طمانیت کا موجب بھی ہو سکے۔ اور آلام و وساوس کے اس گھاؤ

پر مرہم بھی رکھ سکے کہ جو مادی و حسی زندگی کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس موقف کے دوسرے رُخ کو تاریخ نے ہمارے سامنے جس گھناؤنے انداز میں پیش کیا ہے، وہ بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ دنیا سے بے اعتنائی علاحدگی اور بیزاری نے اجتماعیت کو ختم کر دیا ہے۔ عمل و جہاد کے ولولوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ ارتقا کی رفتار رُک گئی ہے، علوم و فنون کے دروازوں پر جہل و نادانی کے قفل ڈال دیے گئے ہیں۔ تہذیب و تمدن کے ایوانوں میں سناٹا ہے۔ اور زندگی محض ایک مقدس اور خشک ڈھونگ ہو کر رہ گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسلام ان دونوں راہوں میں سے کس راہ کو پسند کرتا ہے، اور دونوں میں جو متضمن و پنہاں خطرات ہیں ان سے بچنے کی کیا تدبیر بتلاتا ہے؟

یہ دونوں راہیں بالکل صاف اور متعین ہیں۔ ایک راہ تو یہ ہے کہ دنیا کو اس کے تمام لوازم کے ساتھ قبول کیا جائے۔ اسے ترقی دی جائے، اس کے گیسوئے تابدار کو اور تابدار بنایا جائے۔ اس کے لطائف، اور اس میں مضمر تمام نوع کی تمدنی و تہذیبی راحتوں اور مسرتوں کا خیر مقدم کیا جائے۔ لیکن اس احتیاط اور توازن کے ساتھ کہ ان کا رُخ مادیت کی طرف مڑنے نہ پائے اور اس ضروری شرط کے تحت کہ اس عالم مادی اور خیر و خوبی کے عالم میں تضاد اور دوئی باقی نہ رہے۔ بلکہ یہی دنیوی زندگی اور ترقی، ترقیِ آخرت اور بلندی کردار کا سبب بن جائے۔

دوسری راہ دنیا کی تحقیر کی ہے۔ اس سے بلاشبہ، انفرادی کردار کی حد تک تابش و ضوء کا ناتمام سا اہتمام کیا جا سکتا ہے مگر بھرپور زندگی کے بغیر بھرپور اخلاقی شعور و کردار کی نشو و نما نہیں ہو سکتی علاوہ ازیں اس سے کوئی اجتماعیت نہیں پیدا ہوتی، کوئی تمدن پروان نہیں چڑھتا، اور علوم و فنون کے قافلے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ذہن و فکر کی تاریکیاں، جاہلانہ قسم کی رہبانیت میں زیادہ سکون محسوس کرتی ہیں۔ جدید متکلمین کا فرض ہے کہ وہ ان دو مختلف رجحانات میں سے ایک کی تعیین کریں۔ اور جب ان میں ایک راہ متعین ہو جائے تو پھر ہمیں دیانتداری کے ساتھ اپنے فلسفہ، ادب اور مابعد الطبیعیات کا پورا پورا جائزہ لینا ہوگا، اور دیکھنا ہوگا کہ ان

ہیں کون کون عنصر یا خیال غیر متعلق، غلط اور اسلام کے حقیقی مزاج کی رو سے بے جوڑ یا اَنمل ہے۔ جدید علم الکلام میں خیالات وافکار کی ہم آہنگی نہایت ضروری ہے۔ اگر ہم یہ کر سکیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہمیں ایک رہنما اصول ہاتھ آجائے گا جس کی روشنی میں ہم زندگی کی تعمیر نو کا مسئلہ آسانی سے حل کر سکیں گے یعنی ہم ایک نئے مگر خالص اسلامی فلسفۂ حیات کی طرح ڈال سکیں گے۔

ہم اس لفظ کی وضاحت اس بنا پر ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمارے ہاں یہ دونوں رجحانات کچھ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ جس سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں، اور ہم فیصلہ نہیں کر پاتے کہ اسلام کا موٹو ———— کیا ہے۔ یہ کہ بھرپور زندگی کے بغیر مکمل سیرت کی تشکیل محال ہے، یا یہ کہ زندگی کی تحقیر اور نفی ہی اعلیٰ کردار کی ضامن ہے؟